© rasailojaraid.com

اسلام اور مغرب

حقیقی فرق کیا ہے؟

گڈرون کرامر

گڈرون کرامرایک اسلامی سکالر ہیں۔ وہ اس مقالہ میں مسلمانوں کی برداشت اور مذہبی آزادی کے بارے میں بحث کرتی ہیں، موجودہ دور کے تنازعات میں صلیبی جنگوں اور نوآبادیات کے کردار اور مغربی ناقدین کی غلط فہمیوں کا تذکرہ بھی اس مضمون کا حصہ ہے۔

مسلم اور مغربی دنیا کے تعلقات میں کسی نہ کسی قسم کی بے وقعتی پائی جاتی ہے۔ بدگمانی اور خوف کی زہریلی سڑانڈ پھیل چکی ہے۔ بنیادی طور پر بے چینی تشدد کے معاملہ سے منسلک ہے۔تشدد جو ماضی سے لے کر اب تک جاری ہے اور اپنی پوری آب وتاب سے غیرت کے نام پر قتل، خودکش حملوں، صلیبی جنگوں، نوآبادیات، طالبان، ابوغریب، شریعۃ، سکارف، فرانس میں نوجوانوں کے ہنگاموں، جہاد، اسرائیل، پیغمبر کی توہین اور آزادی اظہار جیسے مسائل کی شکل میں موجود ہے۔آج کی دنیا کتنی الجھنوں سے بھرپور ہے!

یورپ، مغرب اور عالم مسیحیت، بالکل اسی طرح ہم معنی الفاظ بن چکے ہیں جس طرح مشرق وسطیٰ، اسلامی دنیا اور فی نفسہ اسلام کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔نظریہ اور عمل، بے آمیزش نظام عقائد اور آلودہ عمل بڑی بے فکری سے باہم گڈمڈ کردیئے جاتے ہیں۔ سیاسی تنازعات ثقافتی ٹکراؤ کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور ثقافتی ٹکراؤ سیاسی تنازعات کی شکل اپنا لیتے ہیں۔

اکثر اوقات قائم شدہ خیالات بھی اتنا ہی اثر انداز ہوتے ہیں جتنا کہ حقائق۔ تاہم موجودہ کشمکش کے حوالے سے صریح حقائق بہت حد تک حوصلہ شکن ہیں۔ ایک وقت تھا کہ جب 'اسلام' اور 'مغرب' کے درمیان واضح امتیاز ممکن تھا۔مگر یہ فرق اب موجود نہیں رہا۔سرحدیں مٹ رہی ہیں لاکھوں مسلمان مرد اور عورتیں مغرب میں قیام پذیر ہیں اور بہت سے مسلمان مغربی ممالک کی شہریت اختیار کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب وہ مغرب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

تنازعات حقیقی ہیں

اسلامی دنیا کے برعکس مغرب نے اپنے سیاستدانوں، جرنیلوں، اپنی مادہ پرستی، ٹیکنالوجی کی ترقی، ذرائع ابلاغ اور تنظیمی اصول وضوابط کے ذریعے اسلامی دنیا پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ سب ایسے لوازم ہیں جن سے صرف دنیا سے کنارہ کش لوگ ہی مکمل طور پر دور رہ سکتے ہیں۔ ماضی میں رونما ہونے والے حالات وواقعات کے نتیجے میں پیدا شدہ تنازعات بہت حقیقی ہیں۔

تاہم، استدلال کو عیسائی میراث اور اپنے آپ کی روشن خیالی کے واحد وارث خیال کرنے کے موجودہ یورپی رجحان کے تناظر میں، یورپ کے شہریوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اس وقت استدلال کا دامن سے ہاتھ سے چھوڑ دیں جب اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات زیر بحث ہوں۔ آیئے مذہب سے بات کا آغاز کرتے ہیں خاص طور پر جرمنی کے لوگ یہودی ونصرانی (عقلی) روایت کو یورپی شناخت اور کلچر کا لازمی اور بنیادی حصہ سمجھنے کے عادی ہیں۔ تاہم حقائق متنازعہ فیہ اور غیر واضح بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسی علمی روایات کے ضمن میں اسلام کو (برائے نام) ذکر کا بھی حقدار نہیں سمجھا جاتا۔ فاضل مؤرخین زیادہ سے زیادہ سپین کے اسلامی دور کا سرسری حوالہ کر دیتے ہیں، جہاں مسلمان اور یہودی علماء نے یونانی کلاسیکی ادب کے ترجمے کر کے عیسائی مغرب کو ارسال کیے۔ یہودی اور مسلمان علماء کے اس کارنامے کی وجہ سے یورپ کے ثقافتی ورثے میں انہیں ایک مناسب مقام دیا جاتا ہے، مگر یہ مقام انہیں مفکرین کی بجائے محض پیغام رساں کی حیثیت سے دیا جاتا ہے۔ تاہم مذہبی تناظر میں ان کی اس شناخت کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔

کئی صدیوں سے عیسائی حضرت محمد ﷺ کو ایک جھوٹا پیغمبر (نعوذ باللہ) سمجھتے رہے، حتیٰ کہ آج بھی غالباً چند عیسائی ہی آپ ﷺ کو سچا پیغمبر سمجھتے ہیں۔ یہودیت اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عیسائیت کے لیے اسلام کا رویہ بالکل مختلف ہے۔ اسلام صریحاً اپنے آپ کو اسی توحیدی روایت سے منسلک کرتا ہے جس کو اس کے دو ساتھی الہامی مذہب بھی مانتے ہیں۔ اسلام ان دو مذاہب، یہودیت اور عیسائیت، سے اپنا تعلق قائم کرتا ہے، ان سے رشتہ استوار کرتا ہے، مگر ساتھ ہی اپنے آپ کو ان سے افضل گردانتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تورات کے بعد عیسائیوں کے لیے انجیل نازل ہوئی، مسلمانوں کا کلام [قرآن]، وحی کے سلسلہ کے خاتمہ کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسلام میں تورات اور انجیل کا احترام کیا جاتا ہے مگر سچا پیغام صرف قرآن پاک میں موجود سمجھا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو اسلام میں پیغمبر تسلیم کیا جاتا ہے، مگر محمد ﷺ ''خاتم الانبیاء'' ہیں۔

صحیح طور پر واضح نہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کیا حیثیت ہوتی ہے جب اسلام مؤمنین اور کفار کے درمیان امتیاز قائم کرتا ہے، اگرچہ یہ امتیازات کسی طور پر بھی ان امتیازات سے کم شد و مد سے قائم نہیں کیے جاتے جس شدت سے مغربی دنیا میں یہ یہودیوں اور غیر یہودیوں کے درمیان، یا عیسائیوں اور ملحدین کے درمیان قائم کیے جاتے ہیں۔

قرآن کے چند اقتباسات میں عیسائیوں اور یہودیوں کا بطور اہل کتاب ذکر موجود ہے، مگر قرآن میں چند دوسرے مقامات پر انہیں ایسے منکرین کی صف میں کھڑا کیا گیا ہے جن کے ساتھ مسلمانوں کو ہر دستیاب ذرائع کی مدد سے جنگ کرنی چاہیے۔ علم الٰہیات میں یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے، کیونکہ قرآن پاک کی تعلیمات اور مسلمان علماء کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننا (مسلمانوں کی نظر میں) کافی حد تک کثیر خداؤں کی پرستش یعنی شرک کے قریب لے آتا ہے، کیونکہ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ عیسائی ایک خدا کی عبادت نہیں کرتے۔ بہت سے دوسرے پہلوؤں کی طرح یہ نکتہ اس ضرورت کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے کہ کس حد تک قرآن تعبیر کا متقاضی ہے اور اس کی تعبیر کی ضرورت موجود رہی ہے۔ قرآن خدا کا ایک ایسا پیغام ہے کہ جس میں مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق تحریف نہیں ہوئی اور ایسے لوگ (کثیر تعداد میں موجود ہیں جو) اس کے لفظی مفہوم پر اصرار کرتے ہیں۔

قرآن پاک کی تعبیر وغیرہ کے بارے میں باتیں بنیاد پرستوں کو لازماً برہم کرتی ہیں جو صحیفے کی لفظی تعبیر پر بضد ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس [قرآن کے لفظ بہ لفظ] پر عمل بغیر کسی چوں چراں کے کیا جانا چاہیے۔ اس کے باوجود بھی قرآن کی تعبیر پر اصرار درست ہے اور سوچ بچار کرنے والے مسلمان ہمیشہ سے اس ضرورت کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔

حقیقت پسندانہ رواداری

عملی طور پر صورتحال کافی حد تک تسلی بخش رہی ہے۔ یہودی اور عیسائی شہریوں کو (جو مسلمانوں کے علاقوں میں قیام پذیر تھے) مسلمان حکام کی طرف سے تحفظ حاصل تھا کیونکہ بہر حال وہ بھی وحی کے حامل تھے اور مسلمانوں کی طرح ایک خدا کو مانتے تھے۔ مسلمانوں نے یہ تحفظ اپنے اس مذہبی عقیدے کے باوجود فراہم کیا کہ یہودی اور عیسائی دینی کتب میں تحریف واقع ہو چکی ہے۔ لہٰذا ''ذمی'' کی اصطلاح کے ذریعے یہ خاص رعایت ان یہودیوں اور عیسائیوں کو حاصل تھی جو اسلامی حکومت کی عملداری میں رہتے تھے۔ یہ ایک استثنائی رعایت تھی جو ان کافروں کو، مسلمانوں کے جانی دشمن، سے الگ شناخت کرنے کے لیے استعمال کی گئی۔ جزیہ کی متعین رقم کی ادائیگی کے عوض ان کی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی اور اس بنا پر انہیں جسمانی تشدد سے تحفظ حاصل تھا۔

جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا میں مسلمانوں کی فتوحات کے عرصہ کے دوران ہندوؤں اور بدھ مت کے پیروکاروں کو ذمیوں جیسی حیثیت دی گئی تھی، اگرچہ ان مذاہب کے لوگ بمشکل ہی توحید پر عقیدہ رکھتے تھے۔ مسلمان تمام دوسری قوموں کی طرح مذہبی اور سیاسی ضرورت کے درمیان فرق کیا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں کی فتوحات کے نتیجہ میں اسلامی سلطنت میں وسعت پیدا ہو رہی تھی تو مسلمانوں نے اپنی تاریخ سے حاصل شدہ عملی سبق کو یاد رکھا اور تحمل کا مظاہرہ کیا۔

تمام غیر ملکی حملوں کی طرح مسلمانوں کی حاصل کردہ فتوحات میں بھی تشدد کا عنصر یا کم از کم اس کا ڈراوا شامل ہوتا تھا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو آج کے دور کے بہت سے مسلمان تسلیم کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ مغرب کی گزشتہ نوآبادیاتی غالب قوتوں کی طرح مسلمان ترجیح دیتے ہیں کہ ان کے (ماضی کے) کردار کو انسان دوستی کے زمرے میں ظاہر کیا جائے حالانکہ حملے اور قبضے کے پس پردہ ہمیشہ مقصد یہ کارفرما ہوتا تھا کہ دوسروں کو اپنی تہذیب وثقافت کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ تاہم اصولی طور پر تسلیم کرنا چاہیے کہ مسلم فاتحین نے اپنی رعایا کو اسلام قبول کرنے پر کبھی مجبور نہیں کیا۔ اسلام کی طرف جبری تبدیلی کے بارے میں اکثر علماء کا خیال ہے کہ قرآن پاک میں صریحاً ایسا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ''مذہب میں کوئی جبر نہیں'' (سورہ بقرۃ، آیت ۲۵۶)

تصویرِ حالات حوصلہ افزا نہیں

مذکورہ حالات میں برداشت مذہبی رواداری کی صورت اختیار کر گئی مگر یہ رواداری اس حد تک نہ پہنچ سکی کہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو مذہبی لحاظ سے برابر مان لیا جاتا یا یہ تسلیم کر لیا جاتا کہ وہ بھی انہی حقوق کے مستحق ہیں جو خود انہیں حاصل ہیں۔ مگر یہ رویہ یورپ میں بھی انیسویں صدی تک برقرار رہا۔ قانون کے ذریعے مذہبی اقلیتوں کے لیے مساوی حقوق کی فراہمی نسبتاً موجودہ دور کا تصور ہے۔ یورپ کو مجموعی طور پر اس تصور کو عملی جامہ پہناتے ہوئے متعدد مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر برداشت، مذہبی رواداری کے مفہوم میں ایک قسم کا خصوصی معیار ہے تو اسلام نے جو تاثر اس ضمن میں قائم کیا ہے مسیحی تاریخ سے کافی بہتر ہے۔ اگر چہ یہ تاثر بھی کوئی زیادہ اچھا نہیں۔ یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے دور میں شاندار ثقافتی کامیابیاں ضرور حاصل ہوئی ہوں گی، مگر یہ ثقافتی کامیابیاں ہر جگہ ایک جیسی خوش آئند نہ تھیں حتیٰ کہ اسلامی سپین میں بھی جسے ماضی کے ایک ایسے ''سنہری دور'' کے طور پر یاد کیا جاتا ہے جہاں مسلمان، عیسائی اور یہودی بقائے باہمی کے ساتھ رہتے تھے۔

اسلامی دور حکومت میں بھی دوسرے مذاہب کے چند پیروکاروں کو ایذا دی گئی، مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا یا اجتماعی قتل عام کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم ایسے واقعات استثنائی تھے، حالانکہ مذہب کی طرف سے کسی اصول کے تحت ان کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یورپ کے ساتھ کوئی بھی موازنہ کرنے کے نتیجے میں، چاہے یہ موازنہ قرون وسطیٰ سے کیا جائے کہ جب عیسائی غلبہ میں تھے، رومی کلیسا کی بدعنوانیوں کی اصلاح کے لیے اٹھنے والی اصلاحی تحریک Reformation کے دور سے موازنہ کیا جائے یا مرکزی مطلق العنانیت کے دور سے موازنہ کیا جائے، اس موازنہ کے نتیجے میں ''اسلام'' ہی ایک واضح اخلاقی فاتح کے طور پر نمودار ہوتا ہے۔

موجودہ صورت حال مختلف ہے۔ چند استثنائی واقعات کو چھوڑ کر مذہبی برداشت کا مظاہرہ اب بھی زیادہ تر اسلامی ممالک میں کیا جاتا ہے۔ تاہم اس دور میں مذہبی رواداری کی صورتحال تسلی بخش نہیں ہے۔ مذہبی اقلیتوں کو برابر قانونی حقوق یا وسیع تر مفہوم میں مذہبی آزادی دینے کے مطالبات دیگر حلقوں سے آنے کے ساتھ خاص طور پر مغرب کی طرف سے بھی لائے جاتے ہیں۔ خاص طور پر اسلامی معاشروں میں قرآن پاک سے ماخوذ مذہبی اور قانونی تصورات نافذ ہیں۔ نتیجتاً غیر مسلموں کو زندگی کے چند شعبوں میں مساوی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے۔ انہیں اپنے گرجوں، خانقاہوں، یہودیوں کے عبادت خانوں اور مندروں کا انتظام کرنے اور ان کی تعمیر نو سے روکا جاتا ہے۔ انہیں اپنے مذہب کی اشاعت کرنے کی بھی آزادی نہیں دی جاتی اور کبھی کبھار انہیں بعض تقریبات اور دفتروں میں جانے سے بھی روکا جاتا ہے۔

ایسے واقعات نہ صرف سعودی عرب جیسے ممالک میں ہوتے ہیں جہاں شریعت کے قوانین نافذ ہیں اور حکام دوسرے مذاہب کی پیروی سے روکتے ہیں بلکہ یہ واقعات ترکی جیسے ملک میں بھی ہوتے ہیں جو ایک سیکولر ملک ہونے کا دعویدار ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اصطلاح ''ترک شہری'' کو ''(سنی) مسلمان'' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی چیزیں مذہب کو سیاسی رنگ دیتی ہیں۔ اس فعل کو ترکی سے باہر دوسرے ممالک کے مسلمان رد کرتے ہیں۔

اکثر ملحدین اور موجودات کے علم کے علاوہ کسی اور حسی علم مثلاً خدا کے وجود کا انکار کرنے والے لوگ کھلے عام اپنے اعتقادات اور خیالات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کئی مسلمان ممالک میں دوسرے مذاہب کو قبول کرنے والے مسلمانوں پر قانونی دفعات (ارتداد) کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ چند ایک ممالک میں (تبدیلی مذہب کو روکنے کے لیے) موت کی سزا دی جاتی ہے، مگر دیوانی قانون کے تحت دی جانے والی سزائیں بھی اکثر بہت سخت ہوتی ہیں۔

مذہبی فرقے مثلاً علوی، کئی صدیوں سے اپنے مسلک پر کاربند ہیں، یا احمدی تحریک اور بہائی فرقہ، جس نے اسلامی برادری سے اپنا تعلق ۱۹ویں صدی میں ختم کر لیا تھا کئی اسلامی معاشروں میں امتیاز یا سنگین ایذا رسانی کا شکار ہیں۔ اس طرح کے واقعات سے مسلمان اور مغربی دنیا کے درمیان تعلقات مزید کشیدہ ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب مذہبی آزادی کو کسی روشن خیال معاشرے کا بنیادی جزء سمجھتا ہے۔

مسلمان دنیا نے کبھی بھی مغربی طرز کی روشن خیالی نہیں اپنائی حالانکہ روشن خیالی کے نفاذ سے جمہوریت، قانون کی حکمرانی، انسانی حقوق کے احترام کی لازمی ضمانت نہیں

اسلامی دور حکومت میں بھی دوسرے مذاہب کے چند پیروکاروں کو ایذا دی گئی، مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا گیا یا اجتماعی قتل عام کا نشانہ بنایا گیا۔ تاہم ایسے واقعات استثنائی تھے اور مذہب کی طرف سے کسی اصول کے تحت ان کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ملتی جیسا کہ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے، مگر پھر بھی روشن خیالی کا نفاذ کرنے پر زور نہیں دیا جاتا۔ روشن خیالی کسی قوم کی طرف سے اپنے مذہب (نہ کہ کسی قوم کا یہ دعویٰ کہ اس کا مخصوص مذہب ہی مطلق سچائی ہے) اور اپنی تاریخ کو افضل قرار دینے کے جواب میں دانشمندانہ رویے کا لازمی مطلوب جزء ہے۔ اکثر مسلمان غیر جانبدار تجزیہ نہیں کر پاتے، جب ان کی ثقافت اور ورثہ زیر بحث آ رہے ہوں۔ تاہم روشن خیالی کا ان کے اندر سے ظہور ہونا چاہئے اور اس کے مخصوص خدوخال سامنے آنے چاہئیں۔

اصلاح کی تحریک کے علمبردار

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان اصلاح کار، مارٹن لوتھر کے جذبہ سے اصلاح کی تحریک نہیں چلا سکتے کیونکہ اسلام میں مذہبی پیشوائی کے ایسے سلسلہ وار مدارج نہیں ہیں جن کے پاس گناہ سے توبہ کے بعد دنیوی سزا کی معافی کے اختیارات ہوں۔ اسلام میں اصطباغ، توثیق، عشائے ربانی، استغفار، مسح بالزیت، عطائے منصب اور مناکحت جیسی مقدس رسومات نہیں ہیں اور نہ مذہبی پیشواؤں کے تقرر کا کوئی باقاعدہ سلسلہ ہے۔ ''عام اشخاص'' کو مقدس صحیفوں کی تلاوت ممنوع نہیں۔ عرصہ پہلے قرآن پاک کے تراجم کو ناجائز سمجھا جاتا تھا مگر اب ایک لچکدار رویہ پایا جاتا ہے۔ مسلمان اب تراجم سے استفادہ کر سکتے ہیں، جن کو محتاط انداز سے قرآن کی ''تفاسیر'' سے موسوم کیا جاتا ہے، مگر اصل عربی صحیفہ کی تلاوت عبادت وغیرہ کے وقت ضروری ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایران اصلاح کی تحریک کا سب سے زیادہ ممکنہ علمبردار ہے۔ ۱۹۷۹ء کے اسلامی انقلاب سے شیعہ مذہبی پیشواؤں نے سیاسی قیادت پر اپنی بالادستی قائم کی ہے۔

سیاسی قیادت پر مذہبی پیشواؤں کی یہ بالادستی شیعہ کی اپنی صفوں میں متنازعہ فیہ ہونے کے ساتھ، مسلم دنیا کی سنی اکثریت کی نظروں میں بھی واضح طور پر غیر اسلامی ہونے کی بناء پر رد کردی گئی ہے۔ سنیوں کے نزدیک حکمران مذہبی گروہ نامی کسی چیز کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ (اس بنا پر) مسلمان جدید دنیا کا حصہ بننا چاہتے ہیں مگر ان سے اپنے اندر اصلاح کی تحریک شروع کرنے اور روشن خیالی اپنانے کا تقاضا کرنا ہی بے معنی اور سعی لا حاصل ہے۔ اسی طرح دیدہ ودانستہ اشتعال انگیزی کی مہمات بھی بے نتیجہ ثابت ہوئی ہیں مثلاً جیسے توہے، پیغمبر، کہا جاتا ہے پیغمبر کے خاکوں کی سادہ اشاعت کے عمل سے آگے کچھ نہیں۔ لوگوں کے عام عقیدے کے برعکس، ایسے نقوش اسلامی آرٹ میں موجود ہیں۔

(مسلمانوں کی حساسیت کے) اس خاص زخم کو کریدے بغیر آزادی اظہار، فنی آزادی اور آزادی دانش جیسے حقوق کا تحفظ اور دفاع یقینی طور پر ممکن ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ جوشیلے متشدد مجنونوں کے آگے ہتھیار ڈالے جا رہے ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو مناسب اور جائز تکریم دی جا رہی ہے۔ پیغمبر کی توہین اسلام کو اپنا ناقدانہ اور روشن خیال جائزہ لینے کے لیے آمادہ کرنے میں بالکل کارآمد نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا اثر بالکل الٹ ہوگا۔

ایک دھماکہ خیز موضوع

یہ کوئی اتفاق نہیں کہ (مسلمانوں کے اندر) اصلاح پسند اور لبرل حلقے اکثر اپنے آپ کو امریکہ، اسرائیل، حتیٰ کہ یورپی پالیسیوں کے نہایت پر جوش ناقدین کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسلام کے بارے میں موجودہ سوچ کی وجہ بہر حال یہ ہے کہ مسلمان اور مغربی دنیا کے درمیان سیاسی طاقت کا توازن موجود نہیں۔ یہ نقطہ ہماری توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کراتا ہے جو اپنے تاریخی تناظر کی روشنی میں غور کا متقاضی ہے۔

آج اسلام کے مغرب کے ساتھ تعلقات ایک ایسا دھماکہ خیز موضوع ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کبھی اس کے برخلاف نہیں رہے۔ درحقیقت دور جدید تک مغرب اسلامی دنیا کے لیے کبھی اتنا بڑا حوالہ نہیں رہا۔ اسلام مشرق وسطیٰ میں پھلا پھولا جہاں یہودیوں عیسائیوں اور زرتشت مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ اختلاف چلتا رہا اور یہ مذاہب کبھی بھی مغرب یا یورپ کی نمائندگی نہیں کرتے تھے۔

اسلام کا بطور دین، آرٹ اور تہذیب کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو ان مذاہب کے ساتھ اشتراک عمل کو ملحوظ رکھے بغیر قابل فہم ہو، چاہے یہ تفسیر الٰہیات، قانون وفقہ، تصوف، ادب، موسیقی، تعمیرات یا سیاسی نظریہ کے کسی شعبہ سے متعلق ہو۔ تاہم آج مسلمانوں کے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ اسلامی تہذیب بہت سے متنوع اثرات کا مجموعہ ہے، کیونکہ اسلامسٹ راہنما یہ نقطہ نظر پیش کرتے ہیں کہ اسلام خالصتاً قرآن اور نبی ﷺ کی سنت پر مبنی ہے۔ جدید سیاست دان تمام فریقوں کو اس اختلاط اور باہمی اثرات کے بارے میں متوجہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی روابط ہیں جن میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مذہبی وسیاسی اختلافات کو ہوا دیں۔ مذہبی مباحث نے اب مناظرانہ رخ اختیار کرلیا ہے جن میں دوسرے فریق کو غلط ثابت کر کے خود کو فاتح قرار دیا جاتا ہے۔

عسکری مہمات کے نتیجے میں مادی کلچر کے عناصر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ بہت سے تعمیراتی شاہکار ماہرین نے بنائے جنہیں قابض افواج نے گرفتار کیا۔ عیسائی بازنطین اور یورپ دو خطے تھے جو اس میں شامل تھے۔ ایران اور وسطی ایشیا صدیوں سے ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں جس طرح کہ انڈیا نے بعض شعبوں میں ادا کیا۔ خلافت بغداد کے لیے سسلی اور آئبریا کے علاقے یعنی سپین، پرتگال اور جبرالٹر بہت دور کے علاقے تھے۔ اندلس-اسلامی سپین، کی اہمیت اسلامی دنیا کے مقابلہ میں اہل یورپ کے لیے زیادہ تھی، اس حوالے سے کہ ماضی میں امور کیسے تھے اور وہ آئندہ کیسے باقی رہ سکتے تھے۔

صلیبی جنگیں

آج صلیبی جنگیں (اس حوالہ سے) بہت زیادہ زیر بحث ہیں۔ اپنے عہد میں ان جنگوں نے اسلامی دنیا سے زیادہ یورپ کو متاثر کیا، سوائے ان مسلمانوں کے جو جنوبی انڈونیشیا، شام اور مصر میں تھے۔ انہی علاقوں میں مسلمان شہزادوں اور علماء نے جہاد کے نام پر لوگوں کو صلیبیوں کے خلاف متحرک کیا۔ یہ ایک مقدس جنگ تھی جو بنیادی طور پر دفاعی تھی۔ تاہم خلافت بغداد نے اس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ خلیفہ کی نظر مشرق میں ایران اور ازبکستان، تاجکستان اور جنوب مغربی قازقستان کی طرف تھی۔ صلیبی جنگوں نے اسلامی دنیا کو تہ و بالا نہیں کیا۔ یہ کام تیرھویں اور چودھویں صدی کے منگولوں پر چھوڑ دیا گیا، جنہوں نے چنگیز خان اور تیمور کی قیادت میں یہ کام کیا۔ انہوں نے سمرقند سے بغداد اور دمشق تک تباہی پھیر دی (مغرب کی طرف انہوں نے توجہ نہیں دی)۔

اس کے برخلاف یورپی نوآبادیات کے اثرات گہرے تھے اور شدید بھی اور آج بھی موجود ہیں۔ یورپ کی نوآبادیاتی قوتوں نے اسلامی دنیا کو فتح کرنے کا کام اٹھارہویں صدی میں شروع کیا۔ انہوں نے انڈیا اور انڈونیشیا کو بھی زیر نگیں کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انیسویں صدی میں وہ خلافت عثمانیہ کے زیر کنٹرول عرب علاقوں تک بھی پہنچ گئے۔ عرب دنیا اور ایران دونوں میں نوآبادیاتی دور ماضی قریب کا حصہ ہے۔ یورپ کا نوآبادیاتی تسلط پہلی جنگ عظیم کے بعد اپنی انتہا کو پہنچا جب اس نے سابقہ خلافت عثمانہ میں محفوظ پناہ گاہیں قائم کر لیں۔

جرمنی اسلامی دنیا کے لیے آبادیاتی قوت نہیں لیکن فرانس مغرب، شام اور لبنان میں، برطانیہ مصر، فلسطین، عراق، انڈیا اور ملائیشیا میں، اٹلی لیبیا پر اور سپین مراکش اور موریطانیہ پر ہالینڈ انڈونیشیا پر قابض تھے۔ ترکی واحد ملک تھا جس نے جنگ کے بعد آزادی حاصل کی۔ تمام عملی حوالوں سے ایران غیر ملکی تسلط میں تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی دور کے خاتمے کا اعلان ہوا۔ انڈیا ۱۹۴۷ء، الجیریا ۱۹۶۲ء، اور قدیم Trucial State (موجودہ متحدہ عرب امارات) ایک عشرے کے بعد آزاد ہوئے۔ واقعاتی ترتیب سے دیکھیے تو نوآبادیاتی دور اپنے شکار سے زیادہ دور دکھائی دیتا ہے نسبتاً ان علاقوں کے جو جرمنی کے قریب تھے۔

آج نوآبادیاتی دور کے اثرات متنوع ہیں۔ نوآبادیت مغربی پالیسیوں کے بنیادی تصورات پر اثر ڈالتی ہے، خاص طور پر اسرائیلی اور یورپی اقلیتوں کے تحفظ کے حوالے سے۔ یہ ایسا حق ہے جس پر یورپی قوتیں روایتی طور پر یہ دعویٰ رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ ان قریبی تعلقات کی بنیادیں استوار کرنے کے لیے بھی اہم ہیں جو ترک وطن کے طریقے طے کرنے میں بنیاد ہیں۔ اس طرح سٹریٹجک اور سیاسی تعلقات اور کلچرل تبادلے کے فروغ کے لیے بھی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

آج مغربی اور اسلامی دنیا ماضی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ باہم مربوط ہیں۔ یہ قرب جہاں یکسانیت کو نمایاں کرتا ہے وہاں فرق کو بھی واضح کرتا ہے۔ عیسائی خدا کے بارے میں ایک ہندو کی نسبت مسلمانوں سے بہتر طور پر مکالمہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح مسلمان عیسائی اور یہودی ایک مشترکہ ورثہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ ایک مشترکہ تناظر سامنے لا سکتے ہیں جو اصولی طور پر اقدار سے متعلق بحث کو آسان بنا سکتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانی حقوق کا تصور سب سے پہلے یورپ اور امریکا میں پروان چڑھا جہاں کا غالب مذہب عیسائیت ہے۔ تاہم جو اصول سامنے آئے ہیں وہ اپنی اصل میں عالمگیر بتائے جاتے ہیں۔ انہیں صرف یہودی عیسائی تہذیبی حوالے نہیں سمجھا جا سکتا۔ انسانی حقوق پر مغرب کی اجارہ داری نہیں ہے۔ اس طرح مساوات، انصاف، انسانی وقار، ماحول، تحفظ، غربت اور تشدد کا خاتمہ جیسی اقدار بھی مشترکہ ہیں۔

اب یہ کچھ فیشن سا بن گیا ہے کہ بین المذاہب اور بین الثقافتی مکالمہ کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے اور اسے غیر متعلق قرار دیا جاتا ہے۔ تاہم مکالمہ ایک مفید عمل ہے اگر یہ کسی

> آج صلیبی جنگیں بہت زیادہ زیر بحث ہیں۔ اپنے عہد میں ان جنگوں نے اسلامی دنیا سے زیادہ یورپ کو متاثر کیا، سوائے ان مسلمانوں کے جو جنوبی انڈونیشیا، شام اور مصر میں تھے۔

واضح مقصد کے لیے ہو۔ مکالمہ دوسروں اور ''خود'' کو قریب لانے میں معاون ہوتا ہے۔ اس سے اسلام، اسلام ازم اور اسلام کے نام پر روا رکھے جانے والے تشدد کے فرق کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مکالمہ مغرب کے لیے داخلی سطح پر فرق کو سمجھنے کے لیے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ اس کا سب سے بہتر نتیجہ یہ سامنے آ سکتا ہے کہ اس سے اسلامی دہشت گردی کے خطرے کو کم کیا جا سکتا ہے۔ تاہم یہ یقیناً مشرق وسطیٰ میں نیوکلیئر ہتھیاروں کو نہیں روک سکتا، ترک وطن کی پالیسیوں کو نرم نہیں کر سکتا یا فلسطینی تنازعہ کو حل نہیں کر سکتا ہے۔ تاہم ان میں سے کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو بنیادی طور پر مذہبی ہو۔

☆ پروفیسر ڈاکٹر گڈرون کرامر فری یونیورسٹی برلن (جرمنی) اسلامی علوم کی پروفیسر ہیں، اسلامی تاریخ ان کا خصوصی موضوع ہے، اور مصر، انڈونیشیا اور اسلامی ممالک کی متعدد یونیورسٹیوں میں لیکچر دے چکی ہیں۔ حال ہی میں ۲۰۰۲ء میں جرمن زبان میں فلسطین کی تاریخ پر کتاب شائع کی ہے جس میں عثمانی دور سے آج تک کے واقعات کا علمی تجزیہ پیش کیا ہے۔ کتاب بہت مقبول ہوئی ہے۔

ترجمہ: محمد اشرف طارق

مارٹن لوتھر اور میلکم ایکس، مغرب میں عیسائیت اور اسلام کی نمائندہ تاریخ ساز شخصیات (۱۹۶۴ء)

© rasailojaraid.com